JIBAS (The International Journal of Islamic Business, Administration and Social Sciences) (Quarterly) Trilingual (Arabic, English, Urdu)
ISSN: APPLIED FOR (P) & (E)
Home Page: http://jibas.org
Approved by HEC in Y Category
Indexing: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, Euro pub.
PUBLISHER HABIBIA RESEARCH ACADEMY
Project of **JAMIA HABIBIA INTERNATIONAL,** Reg. No: KAR No. 2287 Societies Registration Act XXI of 1860 Govt. of Sindh, Pakistan.
Website: www.habibia.edu.pk,
This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

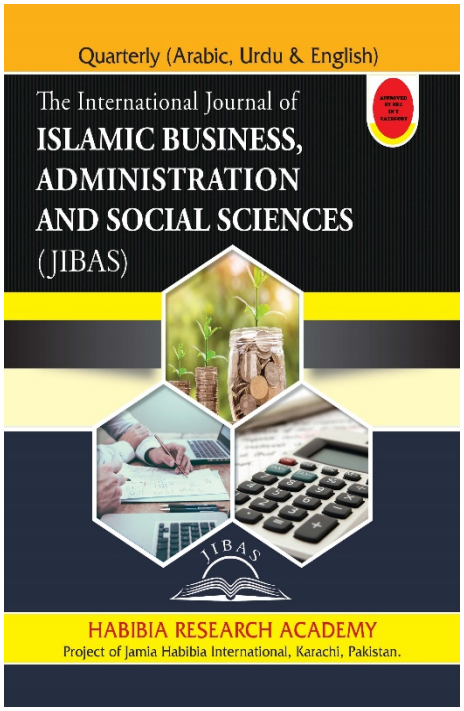

TOPIC:

SOCIAL AND CLASS AWARENESS IN SABIR ZAFAR'S GHAZAL

صابر ظفر کی غزل میں طبقاتی اور سماجی شعور

AUTHORS:

1. *Jindwada Ayaz, Ph.D scholor, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur, Email: jindwadaayyaz.gpc@gmail.com Orcid ID:, https://orcid.rg/0000-0001-7612-1923*
2. *Prof. Dr. Robina Rafique, Chairman Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur. Email: robina.rafiq@iub.edu.pk,Orcid ID: https://orcid.rg/0000-0003-1606-8256*

How to Cite: *Ayaz, Jindwada, and Robina Rafique. 2021. "URDU 2 SOCIAL AND CLASS AWARENESS IN SABIR ZAFAR'S GHAZAL: صابر ظفر کی غزل میں طبقاتی اورسماجی شعور". International Journal of Islamic Business, Administration and Social Sciences (JIBAS) 1 (3):17-38.*
URL: https://jibas.org/index.php/jibas/article/view/22.
Vol. 1, No.3 || July –september2021 || P. 17-38
Published online: 2021-09-30

QR. Code

SOCIAL AND CLASS AWARENESS IN SABIR ZAFAR'S GHAZAL

صابر ظفر کی غزل میں طبقاتی اور سماجی شعور

Jindwada Ayaz, Robina Rafique,

ABSTRACT:

Great scholars and writers in every epoch have struggled to determine the actual human position so that humanity should be driven in a right direction. Sabir Zafar belongs to such a decade of 1970's who's 45 poetic volumes have been published from 1974 to present. Sabir Zafar put his expertise in songs and Ghazal but his skill lies in Ghazal writing. He reflects penetrative experiences through his Ghazal. Sabir Zafar has analysed the unstable behaviours and characters and made them. The topic of his Ghazal. The classical traits like simplicity, comprehension and fluency are found in his poetry. Social and stratum awareness and its development is repleted in his poetry quite clearly. He rendered his motive through poetry by deploying similies and metaphors. He considered the oppression, injustice, inequality, and lack of tolerance as destabilizing the society. He seems very vigilant and vocal against these oppressive practices through his Ghazal. His Ghazal contain political, social and religious thoughts. The poetry of Sabir Zafar airs against cruelty and social discrimination, whether it is human right violation or massacre or terrorism or kidnapping, Sabir Zafar's pen seems to travel through all mazes, he seems protesting without fearing from any consequences.

KEYWORDS: *Ghazal, penetrative, fluency, violation, terrorism, kidnapping, protesting*

صابر ظفر کا تعلق 1970ء کی دہائی کی اس نسل سے ہے جس کے 1974ء سے لے کر اب تک پینتالیس (45) شعری مجموعے تواتر کے ساتھ چھپ چکے ہیں۔ صابر ظفر نے گیت اور غزل میں طبع آزمائی کی مگر ان کے تخلقی اظہار کا بنیادی حوالہ غزل ہے۔ فکری اور فنی سطح پر ان کی غزل میں بے پناہ تجربات دیکھائی دیتے ہیں۔ صابر ظفر نے سماج کے غیر متوازن رویوں اور کردار کو پرکھا اور پھر اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ کلاسیکی روایت سے جڑی غزل میں روانی، سادگی اور سلاست اور سہل ممتنع جیسے اوصاف ملتے ہیں۔ طبقاتی اور سماجی شعور کے حوالے سے ان کی غزل میں ترقی پسند فکر کا اظہار بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے شعری صورت میں اپنا مافی الضمیر منفرد استعارات و تشبیہات کے ذریعے پیش کیا۔ معاشرے میں ہونے والے ظلم، ناانصافی، عدم مساوات اور عدم برداشت کو ہی بنیادی وجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی غزل میں طاغوتی طاقتوں اور اور سفاکانہ نظام کے خلاف بر سرِ پیکار دیکھائی دیتے ہیں۔ ان کے غزلی اشعار میں سماجیات، سیاسیات اور مذہبیات سے متعلق افکار و خیالات پائے جاتے ہیں۔ ظلم، جبر اور معاشرتی اونچ نیچ کے خلاف مزاحمت کا عمل صابر ظفر کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی ہو یا قتل و غارت گری، دہشت گردی ہو یا اغوا برائے تاوان صابر ظفر کا کلام ان ظالموں کے خلاف رواں دواں نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں جنم لینے والے ادیب اور شاعر اس لحاظ سے منفرد تھے کہ انھوں نے نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد نئے جغرافیے اور نئے ممالک کے ساتھ ساتھ اپنے شعور کے سفر کا آغاز کیا۔ یہ لوگ منقسم ممالک کے ہم عمر اور ہم عصر تھے۔ ایک طرف برطانوی سامراج اور پہلی دنیا کے آبادکار ممالک کی پسپائی نے ان کے رگ وپے میں اپنی طاقت اور آزادی کے جذبے کو بھرا تو دوسری طرف دنیا میں طبقاتی نظام کے خاتمے کا علم بلند کرنے والے نظریات اور ممالک کی پیش قدمی بھی ان کو فکری طور پر نئے امکانات سے نواز رہی تھی۔

ستر کی دہائی کے اہم شاعر صابر ظفر اپنی نسل کے سب سے تواتر کے ساتھ چھپنے اور کتابی اعتبار سے سامنے آنے والے شاعر ہیں۔ 1974ء سے 2021ء تک ان کے پنتالیس (45) تشعری مجموعے سامنے آچکے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ توقف ان کی پہلی اور دوسری کتاب میں تھا۔ ان کی دوسری کتاب "دھواں اور پھول" 1985ء میں سامنے آئی۔ گیارہ برس کے بعد سامنے آنے والی اس کتاب میں صابر ظفر نے اپنی منفرد استعارہ سازی اور علامات کے ذریعے سے ادبی دنیا میں اپنے پہلے سے قائم تصور کو مزید مضبوط کیا۔ بعد ازاں ہر برس دو برس میں ان کے شعری مجموعے تواتر سے سامنے آتے رہے ہیں اور وہ خود بھی اپنی شعری ریاضت کے تسلسل کے بارے میں کہتے ہیں۔

؎ روز دکھتا ہے یہ دل ، روز غزل کہتا ہوں
ظلم جس پل کہیں دیکھوں اسی پل کہتا ہوں[1]

.

صابر ظفر اپنی شاعری کے لیے محرک بننے والی چیز معاشرے اور سماج میں روا ظلم کو قرار دیتے ہیں۔ یہ ظلم سماج میں نہ صرف سیاسی حوالے سے تھا بلکہ اس کا سب سے اہم سبب معاشرے میں بڑھتی ہوئی طبقاتی تقسیم تھی جس نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی گرفت مضبوط تر کر لی تھی۔ صابر ظفر ذات کے ہی نہیں بلکہ سماج کے دکھوں کو بھی اسی طرح اپنی شاعری کا حصہ بنایا جس طرح اپنے کسی ذاتی المیے کو۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی رائے میں: ان کی شاعری کئی دہائیوں سے عصری اظہار کا فریضہ سرانجام دیتی چلی جا رہی ہیں (قریباً چار دہائیوں سے) اس اظہار میں ذات، سماجیات، عمرانیات، اقتصادیات، سیاسیات اور ماورا و مابعد سے متعلق افکار و خیالات شامل ہیں۔ ذات کے دکھوں سے سماج کی اذیتوں تک کا بیان، جوہر حساس شاعر اور دھڑکتے ہوئے دل رکھنے والے فنکار کی مثبت ذمہ داری ہے کہ وہ ان دکھوں اور اذیتوں کو لفظوں میں سمونے کے کرب سے گزرنے کا سزاوار ہے۔ یہ اس کا تخلیقی کرب ہے ایک فرض اور قرض جو اسے چکانا ہی ہوتا ہے۔[2]

صابر ظفر کی شاعری کی ابتدا سے ہی ان کا طبقاتی شعور سامنے آتا ہے اور وہ اپنی استعاری سازی کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے سماج کو تین اہم طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اولاً وہ خود کو "پاتال" میں دھکیل دیے جانے والے طبقے کا فرد بتاتے ہیں۔ ان طبقے کے لیے خاموشی، تنہائی اور معاشرے سے کٹ کے جینا نصیب کر دیا گیا تھا اور یہ تقسیم قدرتی نہیں بلکہ سیاسی تھی جسے وہ اپنے قبیلے کے لیے سب سے بڑے دکھ کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ یہ ایسا طبقہ ہے جس کے لیے کوئی عدالت یا کوئی وکیل بھی انصاف دینے کی ہمت خود میں نہیں رکھتا۔

؎ کوئی کرتا ہی نہیں میری وکالت
جانے کس پاتال میں ڈوبی رہی میں[3]

.

صابر ظفر اپنی شاعری میں دوسرے طبقے کو جسے اپنا مخالف اور ظالم بتاتے ہیں اسے "آکاش" کے استعارے سے بیان کرتے ہیں۔ آکاش پر رہنے والے لوگ وہ ہیں جنھوں نے دھرتی کی تمام مراعات کو اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے اور وہ اصلاح کے نام پر خرابیاں پھیلانے کے ذمے دار ہیں۔ معاشرے میں یہ طبقات اپنے اپنے گروہ کے مفادات کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

؎ ہر قدم سب کا کہاں ایک سا احوال ہوا
کوئی آکاش ہوا اور کوئی پاتال ہوا[4]

.

صابر ظفر معاشرے کے ان دونوں طبقات میں بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش میں کبھی تو اپنے اندر سمٹ کے ظالموں کو اپنا قبیلہ مکمل طور پر ختم نہ کر دینے کے لیے اپنی توانائیوں کو بچا لیتے ہیں اور کبھی ان کے خلاف آواز بلند کر کے اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں۔ انھوں نے خود کو حالات کے جبر کا نشانہ تو بننے دیا لیکن ایک عرصے تک اوڑھے رکھے جانے والی خاموشی اور صبر کی چادر کو جب سمیٹا تو پھر احتجاج کی نہ رکنے والی رو کا آغاز ہوا: وہ (صابر ظفر) حالات کے منبر پر کھڑا ایک دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرنے پر تلا ہوا ہے، اس کی نوحہ گری کے بہت سے رنگ ہیں ، رومانویت، مزاحمت، خدا، انسان اور کائنات کے تعلق سے پیدا ہونے والے تجربوں کے رنگ۔ معاشیات، سوسائٹی کا مجموعی رویہ، ہونے نہ ہونے کا جبر۔۔۔ اور بہت سے رنگ جو اس کی شاعری میں رت جگے مناتے ہیں۔[5]

اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں یہ شاعر ابتدا میں مزاحمت کے بجائے پسپائی اور خود کو محفوظ رکھ کے کسی ایسے مقام کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے کہ جس مقام پر پہنچ کے اسے نقصان پہنچائے جانے کے امکانات اگر معدوم نہ بھی ہوں تو بھی ایسا تو ضرور ہو کہ اگر اس طبقے کو یا اس کے نمائندہ اس فرد کو کسی طرح کا نقصان پہنچایا جائے تو اس کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند ہو کر ظالموں کو ظلم سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔

؎ منزل آکاش پہ ہے یا کسی پاتال میں ہے
ڈھونڈنے دل اسے دونوں ہی جگہ جائے گا[6]

.

؎ کبھی آکاش تک گئی آواز
کبھی پاتال میں دبی آواز[7]

.

صابر ظفر کی شاعری کا تیسرا اہم طبقہ "دھرتی کے باسی" ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ تو "آکاش" والوں میں شامل ہے اور نہ ہی "پاتال" والوں میں شامل ہے۔ دھرتی کے باسی وہ ہیں جو نسبتاً ایک آزاد زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول میں انھیں کسی شدید مدافعت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

ے زمینیں ہیں کہیں غلطاں، کہیں آفاق گم گشتہ
مگر ان کے لیے جانا پڑے گا لامکاں کے پار[8]

صابر ظفر کے طویل ادبی سفر کی "ابتدا" سے ان کے پنتالیسویں (45) شعری مجموعے "کیتھوں کی ریکھاؤں میں" تک کا جائزہ لینے سے ان کی زندگی اور شاعری کے بتدریج آگے جانے کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں وقوع پذیر ہونے والے ارتقا کو بھی جانا جا سکتا ہے۔ صابر ظفر مشکل زمینوں میں راہِ سخن کو آسان کرتے اور ایک کوزہ توڑ کر دوسرا بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ زندگی کے تناقضات (Paradoxes) ان کے فن میں بے ساختہ نمود کرتے ہیں چنانچہ وہ سکوت میں سخن کی کشش کے طالب ہیں اور خموش رہ کر ہم نوا بنانے کے آرزو مند۔ ایک طرف انھیں اپنی ذات سے باہر دیکھنا گوارا نہیں دوسری طرف وہ ممکنات سے باہر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کی سنگینی کو نشہ و سرمستی سے سہل بنانے کے قائل نہیں اور ذاتی غموں کو عبور کر کے کائناتی حزن کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔[9]

دھرتی پر آنے والی رتوں میں شاعروں کو اداسیوں اور ذلتوں کی نذر کر دیے جانے والے معاشرے کے طبقات کو سر اٹھانے کا موقع میسر نہیں آ رہا۔ صحنِ چمن میں بہار کے آنے کی یہ نوید انھیں فیض کے اس ترقی پسند نظریے سے جوڑ دیتی ہے جس میں وہ داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کو مسترد کرتے ہیں کہ یہ وہ صبح نہیں ہے جس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ وہ دن جس کے آنے کا وعدہ اور انتظار ہر ترقی پسند کے ہاں نظر آتا ہے اسی کی شنید صابر ظفر کے ہاں ہمیں ان شعروں میں نظر آ رہی ہے۔ دھرتی محکوموں کے پاؤں تلے دھڑ دھڑ دھڑکنے اور خمیدہ سروں کے پھولنے اور پھلنے کے باوجود سرافراز نہ ہونے کی روش پر یہ دھیمی کسک اور ہلکی ہلکی آنچ لیے ہوئے صابر ظفر کا اداسی بھرا لہجہ ان کی فکری وابستگیوں کا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جوش سے بھرے ہونے اور جسم و جاں سے چھلکنے کی بات بھی ان کے ترقی پسندانہ عزائم کی غماز ہے۔ "گردشِ مرثیہ"، "لہو سے دستخط" اور اب "شہادت نامہ" کا فکری حوالہ ہمارا بلوچستان ہے۔ میں نے جب تک بلوچستان کو گھوم پھر کر نہیں دیکھا تھا، میں اس درد اور رنج کو محسوس کرنے سے عاری تھا جو اپنوں کے ہاتھوں زخم کھا کر کسی قوم کی نفسیات کا حصہ بنتا ہے۔ بلوچستان اور اب شاید جنوبی پنجاب بھی ایک سلگتا ہوا خطہ ہے، جس کی آگ کو بیرونی طالع آزماؤں اور اندرونی ہوس پرستوں نے ہر لمحہ ہوا دی ہے۔ اس قدر کہ اس کی تپش اب ایوانِ اقتدار کے دیوار و در تک آ پہنچی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک خوش گو شاعر کے کلام تک۔[10]

مزاحمت اور مسلسل عمل نہ صرف صابر ظفر کے کلام میں پایا جاتا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے منظم ہونے کا یہ ثبوت بھی ہے کہ انھوں نے اپنے شعری سفر میں بھی اور پھر اس کی اشاعت میں بھی کسی طرح کا تعطل نہ آنے دیا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ کتابیں ان کے اصل حق دار یعنی پاکستان کے

پڑھے لکھے اصحاب، شعرا، دانش وروں اور فنکاروں تک مسلسل پہنچاتے رہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا شعر ان کی زندگی اور شخصیت کا درست ترجمان ہے۔

صابر ظفر کی شاعری میں سماج میں سب سے قریبی رشتوں کے بارے میں جو کرب بیان کیا جارہا ہے وہ ان کے ذاتی المیے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سماج میں ہمارے رشتوں میں پائے جانے والی ہم رشتگی کے سماجی اور مادی پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

؎ چاہیے اب تو اے خدا اور ہی مہرباں مجھے
غیر تو خیر غیر ہیں ، بھول گئی ہے ماں مجھے[11]

.

ماں کا رشتہ کائنات میں انسان سے تعلق رکھنے والے رشتوں میں سب سے منفرد یوں ہے کہ جب انسان اس دنیا میں آنے کے راستے پہ ہوتا ہے تو وہ صرف ماں کی ذات ہے جو اس کے بارے میں کئی طرح کے اختیارات کی حامل بھی ہوتی ہے اور اس سے رشتہ رکھنے والی واحد ہستی بھی ہوتی ہے۔ ماں کے پیار میں پائے جانے والی بے غرضی اور دیکھے بنا ہی بچے سے محبت کیے جانے کے جذبے کو انسانی سرشت میں شامل کیا گیا ہے لیکن سماج میں آنے کے بعد اور رشتوں کے جنگل میں بچے اور ماں کا یہ تعلق ہوتے ہوتے ایسی منازل پہ بھی پہنچ جاتا ہے جن کا سامنا ہمارے شاعر کے اس شعر سے مترشح ہے۔ ماں کے علاوہ باقی تمام رشتوں کو وہ غیر سمجھتا ہے اور ماں سے ہی ہر مہربانی کا تعلق جڑتا ہے۔ اب وہ خدا سے مخاطب ہے جو ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ اس خدا سے تقاضا کرتے ہوئے بھی شاعر دنیا میں کسی مہربان ہستی کا ساتھ چاہتا ہے جو ماں جیسے تعلق میں اسے چھوڑے یا بھولے نہیں بلکہ ہر قدم پہ یاد رکھے۔ شعر میں ماں کا چھوڑ کے جانا نہیں بلکہ بھول جانا بیان کیا گیا ہے جس کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن ان میں بہر حال ماں کے دنیا سے چلے جانے کی طرف بظاہر اشارہ موجود نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> تلخی اور طیش میں الجھ کر اور شکستگی، ہیجان اور تذبذب میں سے گزر کر صابر ظفر زندگی کے وسیع و عریض آفاق میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ جذبے اور فکر کے اتصال کا شاعر ہے۔ جذبہ محض اسے اپنے ہی قدموں میں ڈھیر کر سکتا تھا اور فکرِ محض اس کے تغزل کی دولت لوٹ سکتا تھا، مگر وہ تخیل کے ریلے میں تعقل سے کبھی دست کش نہیں ہوا۔ اس نے خارجی آنکھ کھولے رکھی تاکہ اس کی باطنی آنکھ کی بصارت دھندلا نہ جائے۔ جدید غزل میں صابر ظفر کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔[12]

سماج کے تمام اصول اور ضوابط انسانوں کی بھلائی، خیر اور بہتری کے لیے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ یہی بنیادی وصف اور خوبی اگر کسی نظریے سے نکل جائے تو اس کی تمام رسمیات محض کارِ زیاں سے زیادہ کچھ وقعت و حیثیت نہیں رکھتیں۔ شاعر اور ادیب کسی نظریے اور تحریک کے وہ رخ موڑنے والے افراد ہوتے ہیں جو منزل کے نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ نظریے جو لوگوں کو لوگوں کے غلام بنائیں اور انھیں

مزید زنجیروں میں جکڑتے چلے جائیں وہ ناقابلِ عمل ہی نہیں نفرت کے قابل بھی بنتے چلے جاتے ہیں۔ صابر ظفر نے بھی اپنے شعری سفر کے آغاز میں یہ کہ نکتہ جان لیا تھا کہ یہ فلسفے اور نظریے معاشرے میں اگر تبدیلی نہ لا سکیں تو ان کی حیثیت بوجھ سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے:

؎ جو ہو سکے تو کوئی انقلاب لا ورنہ
ہر اک اصول ، ہر اک فلسفے سے نفرت کر[13]

.

روایت کا وہ شاعر جو جنگل اور صحرا کی طرف نکل بھاگنے کی طرف مائل تھا اب انسانوں اور سماج کے مسائل پر بلیغ تبصرے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر بھی ایک آزاد فرد کا خواب ہے جو صحرا میں آہو کی طرح رم کرنے میں آزاد ہوا اور اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کا ہر موقع اس کو میسر ہو۔ وہ معاشرے کے ان ظالم اور قابض گروہوں سے نفرت کرتا ہے جو انسانوں کو زنجیروں میں قید کر کے ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیتے۔ سامراج کے یہ ایجنٹ فطرت کے عناصر اور مظاہر پر بھی پہرے بٹھانے پہ مائل ہیں۔ ان سے شاعر اپنی نفرت کا برملا اظہار کرتے ہوئے اپنا احتجاج سامنے لاتا ہے:

؎ تو نے کیا جال بچھائے نہیں قریہ قریہ
یہ اگر سچ ہے تو ہوگا رمِ آہو کیسے[14]

.

تو سے مراد معاشرے کے وہ تمام افراد ہیں جو پابندیاں لگانے اور انسانوں اور فطرت کے نعائم پر قدغنیں لگانے والے گروہ میں شامل ہیں۔ یوں ہمیں صابر ظفر کے ہاں دو واضح طبقات ملتے ہیں جن میں سے ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم، ایک گروہ قابضین کا ہے اور دوسرا ان اشیا اور مظاہر کا اصل مالک:

؎ رہتے ہیں کرایہ دار گھر میں
بے گھر ہیں جو صاحبِ مکاں ہیں[15]

.

ان سامراجی طاقتوں کے ہاتھ انسانوں کو اس حد تک مجبوری کا سامنا ہے کہ وہ اپنے گھروں سے بے گھر ہو کے بنیادی انسانی ضروریات میں سے پناہ گاہوں تک کو چھوڑنے پہ مجبور ہیں کہ کسی طرح پہلے پیٹ کا جہنم بھرا جا سکے۔ شاعر جانتا ہے کہ انسان کے لیے اس زمانے میں جو "روٹی، کپڑا اور مکان" کا نعرہ لگایا جا رہا ہے یہ کس حد تک انسانوں کے لیے ضروری اور اہم ہے لیکن وہ سسکتے ہوئے طبقات کو جب دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ اصل مالک تو بے گھر ہیں اور گھروں پہ قابض لوگ ان کے وسائل کی معمولی سی قیمت دے کر اپنے لیے تعیشات کا سامان وافر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زندگی انسانوں پہ اتنی تنگ کر دی گئی ہے کہ وہ جینے سے بھی ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔اسی طبقاتی کشمکش اور محرومیوں نے صابر ظفر کے ہاں ایک ایسے مستقل موضوع کی بنیاد ڈالی ہے جو نہ صرف ان کی ذاتی اور شعوری پسند ہے بلکہ اس میں ان کی فکری وابستگیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے:

؎ جہاں سے تنگ ہے ، جاں سے گزرنا چاہتا ہے
جس آدمی کو بھی دیکھو وہ مرنا چاہتا ہے[16]

.

سماج انسانوں سے بنتا ہے لیکن انسانوں کے باہمی تعلقات میں ایسی دراڑ اور خلیج واقع ہو رہی ہے جو ان کو ایک دوسرے کے لیے ہی نہیں خود اپنے لیے بھی ناقابل برداشت کر رہی ہے۔اس کا سبب بنیادی انسانی ضرورتوں کا دسترس سے باہر ہونا ہے اور سماج میں بڑھتی ہوئی طبقاتی تقسیم ہے جو دونوں گروہوں کو انتہا کی طرف لاتے ہوئے زندگی سے بیزار کر رہی ہے۔

؎ عجب ہے رسم یہاں کی چھپے کھنڈر میں رہو
نہ اپنے خول سے نکلو، نہ شور و شر میں رہو
اگر ہوائے زمانہ کے ساتھ چلنا ہے
تمام عمر ظفرؔ آندھیوں کے گھر میں رہو[17]

.

کھنڈر میں چھپنا، صابر ظفر کے ہاں پائے جانے والے طبقاتی شعور میں سے پاتال کے باسیوں کے لیے نصیب کر دیے جانے والی تباہی و بربادی اور سماج سے کٹے ہونے کا استعارہ ہے۔یہ برباد نگر جسے آباد کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی بلکہ صاحبِ اقتدار لوگ اپنے مفادات کے لیے ان کو مزید اجاڑنے پر بھی مائل نظر آتے ہیں۔یہاں صابر ظفر کے ہاں مزاحمت کے بجائے پسپائی اختیار کرنا اس دفاعی حکمتِ عملی کا اظہار ہے جس میں سورما آخری فتح کے لیے خود کو کسی اور دن جنگ کرنے کے لیے محفوظ مقام کی طرف لے جاتے ہیں۔صابر ظفر بھی اپنے خول میں سمٹ کے تنہائی کی چادر اوڑھ رہے ہیں۔

؎ زمیں کی پیاس کہاں بارشوں کے بعد بجھی
سحاب آئے تو کب قحطِ آب ختم ہوا[18]

.

زمیں، دھرتی اور اس پر فلک سے آنے والی بارشیں ان مراعات کی طرف اشارہ ہے جو عوام کے نصیب میں نہیں آتیں بلکہ ان کے لیے مزید تباہی کا عندیہ بن جاتی ہیں۔سیاسی مصلحتوں اور بین الاقوامی مجبوریوں کی وجہ سے ملک میں ڈیم نہ بنائے جانے اور بارشوں اور پانیوں کی سرزمین

ہونے کے باوجود پانی کے قحط کا شکار ہونے والا ملک اپنے مسائل میں کتنا ڈوبا ہوا ہے اس پر شاعر کا یہ بیان ان کی ایمائیت اور اس میں پائی جانے والی مقصدیت کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ ہم بلوچوں کو صرف اس وقت اپنا بنا سکتے ہیں جب کہ ہم ان کے جملہ جائز حقوق کی اسی طرح حمایت کریں جس طرح ہم اپنے حقوق کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کے لیے عوام میں شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صابر ظفر کی یہ طویل غزل اسی سمت میں ایک موثر، بروقت اور ضروری قدم ہے۔[19]

"ابتدا" میں شروع سے آخر تک صابر ظفر نے مختلف سماجی اور طبقاتی حوالے سے اپنی آرا کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مٹی کی محبت، اس کا کھنڈر بنا دیا جانا، عوام کے لیے زر اور سہولتوں کا فقدان، ملک میں جاری و ساری کشت و خون، بستیوں کا اجاڑ دیا جانا اور لوگوں کے دام لگائے جانا ان سب کو بہت تخلیقیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

؎ کھدائی کو کھنڈر کوئی نہیں ہے
اب اس مٹی میں زر کوئی نہیں ہے
وہاں لوگوں کے کیا دکھ درد ہوں گے
جہاں اب نوحہ گر کوئی نہیں ہے[20]

.

؎ بس اتنا یاد ہے کچھ لوگ بک رہے تھے ظفرؔ
خبر نہیں کہ وہ مہنگے تھے یا کہ سستے تھے[21]

.

؎ دکھوں کی لہر ظفر بستیوں میں در آئی
ہنسی مذاق کی باتیں بھی لوگ اب نہ کریں[22]

.

اس مجموعے میں صابر ظفر ترقی پسند استعارہ سازی کے اہم استعاروں کو بھی خود میں سموتا ہے اور صابر ظفر اپنے انفرادی استعارے بھی اس روایت میں شامل کر کے اسے ثمر آور بناتے ہیں۔ اجالا، اندھیرا، قفس، پرندے، صبح، رات، گل، گل چیں، صیاد اور دار جیسے ترقی پسند روایت کے استعارے اس کتاب میں جابجا اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

؎ دریچے میں اجالا اس کے ہونے کا حوالہ تھا
وگرنہ رات کی تقدیر ظلمت ہو بھی سکتی تھی[23]

.

؎ میں ہارا اس لیے تھا میں نے تجھ پر فیصلہ چھوڑا
مری منصف مرے دل کی عدالت ہو بھی سکتی تھی[24]

.

؎ سوچوں دیکھ کے ظلم ترا
کیا ہے دیر قیامت میں
تو نے شامل کر ڈالا
کتنا جھوٹ حقیقت میں[25]

.

؎ ظالم تو نے بگاڑ دیا
سارا کھیل کدورت میں
جب تک تیرا ظلم رہا
شامل رہی بغاوت میں[26]

.

؎ میرا کون سا کام کیا
لے کر مجھ کو رشوت میں
کیا جانے کب آئیں ظفر
اچھے لوگ حکومت میں[27]

.

صابر ظفر کے ہاں سرخ انقلاب کی نوید اور اس سے وابستگی کے واضح بیانات ملتے ہیں۔ان کے ہاں یہ سب کچھ ایک تخلیقی صورت میں سامنے آیا ہے لہٰذا ایمائیت اور رمز کے پردے میں چھپے ہوئے اس کلام میں ہمیں جہاں زر کی تقسیم اور اس کے رشتوں میں در آنے کی بات ملتی ہے وہیں معاشرے کے درد اور غم واندوہ میں اپنے لیے اس سرخ انقلاب کے راستے کا تعین بہر صورت نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی تقسیم پر بھی شاعر اپنا احتجاج رقم کرواتا ہے:

ہوائے درد سے بے رنگ ہوں وگرنہ میں
رگِ گلاب سے لپٹوں تو لال ہو جاؤں[28]

.

گلاب کی رگ سے لپٹنے اور لال ہو جانے میں جو علامتی پیرایہ ہے وہ ان کی فکری وابستگیوں کی طرف اشارہ کناں ہے۔ معاشرے اور سماج کی رسوم نے انسان کے لیے جن دردوں کی چوکیوں کو چوکس کیا ہوا ان کے سامنے اسی نسل کے متقدمین میں سے ایک نے اپنے آپ کو بظاہر الگ تھلگ رکھتے ہوئے بھی فکری طور پر معاشرتی اور طبقاتی تقسیم کے بارے میں اس سے ملتا جلتا ردِ عمل دیا تھا۔

دہم دیکھتے ہیں کہ صابر ظفر نے بھی اسی طرح سے اپنے اس فکری تعلق کو گلاب، پھول اور لال رنگ کی مناسبت سے بیان کیا ہے۔ دونوں شعروں میں دردوں کے باوجود اپنے اندر موجود جوہر کو پہچاننے اور اس کو کام میں لانے کا عزم موجود ہے۔

روایت سے گہرا انسلاک صابر ظفر کو میر، غالب، فیض، فراق، مجید امجد اور دیگر شعرا کے کلام سے جوڑتا بھی ہے اور اس سلسلے میں ایک تخلیقی انداز میں اضافے کا سبب بھی بنتا ہے۔ صابر ظفر شعر کی ہی نہیں بلکہ شاعر کی فضا کی طرف بھی لے جاتے ہیں اور اس عمل میں وہ واضح اشارے دے کر روایت کے معنی میں اضافے کا در کھولتے ہیں:

خبر ہے گرم کہ ہے آج میرے قتل کی رات
کہاں گئے مرے بازو ، کہاں گئے مرے ہاتھ[29]

.

یہ بازو، ہاتھ، قتل اور رات نہ صرف ترقی پسند تحریک کی استعاری سازی کے معروف استعاروں سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ کلاسیکی روایت میں ہمیں غالب کے اشعار اور ان کی ذوق سے معاصرانہ چشمک کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ یہ صرف دونوں حوالوں سے بلیغ اشارے رکھتا ہے۔

عوام کے مقدر میں لکھی گئی مستقل محرومی اور اس کے ساتھ ساتھ ان پر پابندیوں کی یلغار شاعر کو مضطرب رکھتی ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے پاکستان کے تین صوبوں کے دارالخلافوں میں روزگار کی تلاش میں وقت گزارا اور عوام میں رہ کے ان کے دکھ درد کو محسوس کیا۔ عوام کو قسمت اور تقدیر کے قیدی بتا کے ان کی حالت کو مزید بر تر کرنے کے ذمے داروں کا تعین کرنے والے یہ شاعر غاصبوں کے ٹھکانوں کی نشان دہی کرنے کے اپنے فرض سے کبھی غافل نظر نہ آئے۔ وہ جو پہلی مجموعے میں دھیمی دھیمی سی لو تھی وہ اس دوسری کتاب میں ایک الاؤ بنتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے قارئین کے دل میں کچھ چنگاریاں سلگا رہے ہیں۔

آتشِ کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفرؔ
چوبِ منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی[30]

اہلِ منبر کے طاقت وروں کا ساتھ دینے کی روایت ہماری تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ اہلِ علم کی وراثت کے دعوے دار ان لوگوں پر طنز، ان کی مزمت اور ان کے کرداروں کی منافقت اردو غزل کا مستقل موضوع ہے۔ اسی نے غزل میں شیخ، واعظ، محتسب اور ناصح کے ذریعے سے ان کے کردار کی غلاظت سے کراہت اردو غزل میں سمودی۔ صابر ظفر تک آتے ہوئے اس روایت میں جس تکفیری عنصر کا اضافہ ہوا وہ اپنی جگہ الگ ان کے لیے ایک ذاتی المیہ تھا۔ اہلِ علم میں پائی جانی والی یہ کبر، تکبر اور اپنے عظیم ہونے کی برائی کا جو حل شاعر تجویز کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ مذہبی شعائر کے بارے میں ایک حساس بیان ہے۔

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں جیئیں
چراغ ہو تو جلائیں، لباس ہو تو سئیں[31]

صابر ظفر کا مذکورہ بالا شعر ان کے ہاں پائے جانے والے طبقاتی شعور کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کو جان بوجھ کر جہالت کی طرف دھکیلا جاتا ہے تاکہ ان میں اپنے حقوق سے آگاہی پیدا نہ ہو سکے۔ جب عوام میں اپنے حقوق سے آگاہی پیدا ہو گی تو ایک وقت آئے گا جب وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند بھی کرنے لگیں گے اور پھر ان کے لیے کسی حد تک بھی جانا ان کے لیے واحد حل بن جائے گا۔ اس لیے ہی اہلِ حکم لوگوں کو اپنے حقوق سے آگاہ نہ ہونے دینے کے لیے اندھیرے میں رکھتے ہیں۔ یوں چراغ کا نہ ہونا اور لباس کا نہ سیا جانا جس محرومی کا آئینہ دار ہے وہ سماجی حوالے سے طبقاتی تقسیم کے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ بن جاتا ہے۔

صابر ظفر کی غزل میں سماج اور اس کے مختلف طبقات کے لیے حساسیت کے نمونے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کچھ اہم شعری مثالیں درج ذیل ہیں:

تمھارے حق میں چلو ہم ہی بولتے ہیں ظفرؔ
یہ زہر تم نہیں پیتے تو لاؤ ہم ہی پئیں[32]

یہ ربط ہے جسم اور جاں کا
بچوں کے بغیر گھر کہاں کا[33]

؎ علاجِ اہلِ ستم چاہیے ابھی سے ظفرؔ
ابھی تو سنگ ذرا فاصلے پہ گرتے ہیں[34]

.

صابر ظفر کی غزل میں طبقاتی و سماجی شعور وقوع پذیر ہوتا ہے وہ ان کا اپنے پیشے اور اس سے منسلک جھوٹ اور پروپیگنڈے کو بے نقاب کرنا ہے۔اخبارات، ریڈیو اور ٹی۔وی کے ذریعے جو مخصوص بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے اس پر بھی وہ طنز کرتے ہیں اور سماج میں روا رکھے جانے والے بلکہ فروغ دیے جانے والے طبقاتی فرق کو بھی وہ تسلسل سے بیان کرتے ہیں۔

؎ فریاد کناں نہیں بس اک میں
چاروں ہی طرف دہائیاں ہیں[35]

.

؎ بنائیں آپ ہی مقتل کو اس نگر کو ظفر
نہ یہ نگر بنے مقتل دعا کیے جائیں[36]

.

جواں سالہ بیٹے کی مرگ پر خون کے آنسو رلا دینے والے مجموعے میں ظلم اور جبر کی عمدہ مثال ان کے کلام کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اس قتل، اس کے مقدمے اور انصاف کے حصول کے حوالے سے ایک اور دردناک پہلو جو اس مجموعے کے متعدد شعروں میں سامنے آتا ہے وہ انصاف نہ مل پانے سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ خود اس مقدمے کو مزید طول نہیں دے سکتے کہ یہ ان کے لیے مزید نقصان کا سبب بھی بن سکتا ہے۔شاعری کے پردے میں کی جانے والی یہ باتیں معاشرے میں اس سنگین طبقاتی تقسیم کی قباحتوں کو بیان کرتی ہیں جن کی وجہ سے لوگ اپنے بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔

؎ پاؤں گا اپنا ہدف جاؤں گا اس کی طرف
ٹھہرا ہوا میں ابھی شوقِ شہادت میں ہوں[37]

.

؎ کیسے کیسے لال بچھڑ گئے لوگوں کے
سارے ہی گھر بار اجڑ گئے لوگوں کے[38]

.

جبر کے نام پہ گم شدہ کر دیے جانے والے لاپتا افراد کو کسی عدالت یا قانون کی گرفت میں لائے بغیر جس طرح سے اپنے پیاروں سے دور کیا جا رہا ہے اس پر شاعر کے ہاں احتجاج اپنی مکمل صورت میں سامنے آ رہا ہے اور اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہوئے کسی طرح کے خوف کا شکار بھی نہیں ہے۔

؎ سب ظلم و ستم پہ چپ ہیں جیسے
ہو یہ کسی بے زباں کی دنیا[39]

.

"چین اک پل نہیں" میں وہ اہلِ سیاست کی ریشہ دوانیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سماج میں بڑھتی ہوئی بھوک، افلاس، بد اخلاقی، بے راہ روی اور قتل و غارت جیسے موضوعات کو غزل کا حصہ بنایا گیا ہے۔

؎ لگ گئی کیا ہوا سیاست کی
تیرے عشاق اور بد اخلاق[40]

.

؎ کس لیے مر رہا ہوں بھوک سے میں
مجھ سے غافل ہے کیا مرا رزاق[41]

.

اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے "منصور حلاج کے نام" کی جانے والی یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک بہت الگ کتاب ہے کہ اس میں شاعر نے جس کیفیت کو بیان کیا ہے وہ اپنی اصل میں کسی اور سمت جاتی ہے۔ 2002ء میں سامنے آنے والی ان کی غزلیات کا یہ تیرھواں مجموعہ کتاب کے انتساب سے ہی کچھ علامتی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ منصور حلاج کے دعوے اور مصلوب ہو جانے کے تناظر میں وہ اپنے کچھ مکاشفات کو بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں جو اشارے موجود ہیں وہ اس کے مناقب بیان کرتے ہوئے کسی اور شخصیت کی تعریف و توصیف کا بیان بن جاتے ہیں جس کے نام کو وہ کھل کر بیان بھی نہیں کرنا چاہتے اور بیان کیا بنا ان کا گزارا بھی نہیں۔ یوں نعتیہ کیفیات کا حامل یہ مجموعہ اور اس کی غزلیات جس شخصیت کا قصیدہ بنتی ہیں اس کی حیثیت پاکستان میں متنازع ترین شخصیات میں سے ہے۔ یہاں تک کہ آئینی لحاظ سے ان شناختوں کی کچھ حدود متعین کر دی گئیں۔ کتاب کے ممدوح کے لیے ایک مستقل استعارہ ان کے ہاں پہلے بھی موجود تھا اور اس کتاب میں بھی ہے وہ ہے "دلربا"۔ یہ نام یا استعارہ جس شخصیت کے بارے میں ہے اسے وہ "ختم" کے بعد آنے والا قرار دیتے ہیں۔ "ختم کے بعد" جس غزل کا ردیف ہے اس میں ان کے ممدوح کے خدوخال اور ان کی عقیدے کے اشارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی "ختم" کے لفظ کا ذو معنی استعمال کہیں کہیں تقیہ کی حدوں کو بھی چھو جاتا ہے۔ کہیں اس شخصیت کو شاعر مسیحا بھی کہتے ہیں۔ خلافت کے جاری ہونے کی طرف

اشارے کرتے ہوئے خلافتِ جاریہ کی بات کرتے ہیں۔ذیل میں دیے گئے اشعار بیان کیے گئے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں صابر ظفر کے سیاسی، سماجی، طبقاتی اور نظریاتی شعور کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں:

؎ گزارنا ہو اگر زندگی سہولت سے
تو ربط زہد سے لازم ہے اور خلوت سے[42]

.

؎ میں حق کے ساتھ ہوں اور حق ہے میرے ساتھ ظفر
نہ بار بار مجھے لے کے جاؤ مقتل میں[43]

.

؎ حق سرِ دار سرافراز سدا
جہل منڈلاتا ہے چیلوں کی طرح[44]

.

؎ وہ اس کا دار کی لکڑی کو خوں سے کرنا سرخ
وہ اس کی موت کے پنجرے میں طائرانہ پکار[45]

.

جدید سماجی نظام میں بھی گھر کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن جدید سماج کی تشکیل میں گھر کو ایک باغ یا جنت کا نمونہ بنانے کے بجائے ڈسپوزایبل کلچر کی جو بنیاد پڑی ہے اس نے گھر میں سے دالان، در، دریچہ، گلدان اور ایسے تمام مظاہر کی جگہیں ختم کرنا شروع کر دیں جن سے کلاسیکی یا رومانوی عہد میں گھر ہی باغ یا جنت بن جاتا تھا۔نئے گھر میں دالان کی جگہ کا نہ ہونا سڑک کی طرف لے آتا ہے۔دوسرا پہلو اس شعر کا یہ بھی ہے کہ گھر میں ایک ایسا روزن یا راستہ بہر حال رکھا جاتا ہے جو بیرون سے رابطے کی کھڑکی بن کے اسے سماج سے الگ بھی نہیں کرتا اور گھر کے راز کو بازار کا یا سڑک کا حصہ بننے کے بجائے اس سڑک کی دھوپ اور دھول سے تو بچنے کی ترغیب دیتا ہے لیکن چاندنی کا لطف اٹھانے کی دعوت سے بھی نہیں روکتا۔صابر ظفر کے ہی معاصر شاعر جمال احسانی کے ہاں یہ مضمون اس طرزِ تعمیر کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

؎ اگر میں کھڑکیاں دروازے بند کر لیتا
تو گھر کا بھید سرِ رہ گزر چلا جاتا[46]

.

اندھیری رات، آنسو، چمک، ہوا اور دیا ترقی پسند استعارہ سازی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں شاعر اپنی نسل کی بے بسی کو مارشل لا کے جبر سے جوڑتے ہوئے اپنی نوکری اور زندگی بچانے کے لیے صرفِ نظر کرنے اور خاموشی اختیار کرنے کی مجبوری کے جواز کے طور پر لائے ہیں۔

مذکورہ بالا اشعار میں جہاں ہمیں صابر ظفر کے ہاں مذہبی شعور کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں وہیں ان کی مذہبی وابستگیوں کے بھی اشارے موجود ہیں۔ دوسری طرف اس اقلیت پر کیے جانے والے مظالم اور اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے خلاف اظہار بھی موجود ہے۔ یہ شعری احتجاج اقلیتوں یا الگ کر دی جانے والی جماعتوں کی نفسیاتی کیفیات کو سمجھنے میں بھی معاونت کرتا ہے اور ان کے مسائل کو سمجھ کے ان کے تدارک کے لیے بھی دردِ دل رکھنے والے اذہان و قلوب کو مائل کرتا ہے۔ روسو نے اپنے "معاہدۂ عمرانی" کا آغاز اس طرح کیا ہے "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔" یہ بات خاصی حد تک درست ہے لیکن بقول کارل مارکس "احساسِ جبر سے آزادی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔"۔۔۔ علی شریعتی نے چہار زندان کا اس طرح تعین کی ہے۔ زندانِ فطرت، زندانِ تاریخ، زندانِ معاشرہ اور زندانِ ذات۔ ان میں اولین تین زندان تو خارجی قید خانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ چوتھا یعنی زندانِ ذات، داخلی قید خانہ ہے۔ علی شریعتی کہتے ہیں کہ پہلے تین زندانوں سے رہائی علم و حکمت کے ذریعے ممکن ہے لیکن زندانِ ذات سے رہائی کا واحد راستہ عشق ہے۔[47]

آزادی اظہار رائے صابر ظفر کے ہاں ایک مستقل موضوع ہے جس پر وہ اکثر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ جدید سماج میں جہاں فرد کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی حاصل ہوئی وہیں کچھ ایسے موضوعات بھی در آئے جن پر بات بھی نہ کرنے دینے کی رسم چل پڑی۔ اپنا نقطۂ نظر بیان نہ کر پانے کی اذیت صابر ظفر کے ہاں بار بار در آتی ہے:

؎ امید انصاف کی رکھیں گے ہم اور وہ بھی تم کافر ادا سے
تمھارا اس طرح معصوم لوگوں سے مذاق اچھا نہیں ہے[48]

.

؎ ذرا مجالِ سخن دو کہ ہے یہ مان مجھے
سنی حکایتِ دل جس نے ہم نوا ٹھہرا[49]

.

؎ خاموش ہر زبان ہے یوں ظلم پر ظفرؔ
بستی میں جیسے کوئی غزل گو رہا نہ ہو[50]

؎ سماعتوں کی فصیلوں پہ ایسا پہرا تھا
کہ پھڑپھڑاتا ہوا طائرِ سدا بیٹھا[51]

.

جنگ اور تشدد کے حوالے سے پاتال کی تیسویں غزل جس کا ردیف "پھر کوئی میں تھا نہ تو" بہت اہم ہے۔ صابر ظفر اس میں جنگ کے نتیجے میں برپا ہونے والی ہولناکی کی صورت میں ہر طرح کے لوگوں کے قتل اور تباہی کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ردیف میں موجود دو مختلف گروہوں اور طبقوں کو بھی باہمی اشتراکات پر کچھ سلسلے بحال کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں جب طرفین کے تمام لوگوں کو خطرہ ہو اور دشمن بھی مشترک ہو تو تب اس دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اور تو کے جھگڑے کو کچھ وقت کے لیے پسِ پشت ڈال دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ے جنگ رہی رات بھر، سرخ تھا رنگِ سحر
بہہ گیا سب کا لہو، پھر کوئی میں تھا نہ تو
خلق تھی خوار و زبوں ، سارے علم سرنگوں
کوئی نہ تھا دو بہ دو، پھر کوئی میں تھا نہ تو[52]

.

سیاسی حوالے سے جب دو متحارب گروہ کسی آمر کا مقابلہ کرنے نکلتے ہیں تو ان دونوں کو ہی اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں ایوب آمریت اور یحیی آمریت کے بعد ضیاالحق کے مارشل لا میں بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ دوسری طرف سماجی حوالے سے ہندوستان یا دوسرے کسی ملک کے مفادات کی بھینٹ چڑھتا ہوا پاکستان بھی اس کے مختلف طبقات کے مابین ایسے کسی سماجی معاہدے کا عندیہ دے رہا تھا جو انھیں مشترکہ دشمن کے مقابلے میں یکجا کر سکے۔

ہم اکیسویں صدی میں بھی "جدید تر نوآبادیاتی آمریت" کے مقابل ہیں جو دونوں سطحوں اندرونی اور بیرونی سطح پر قائم ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں کسی حد تک اظہارِ جذبات کی آزادی ہے اس کے بعد ایک طویل گم شدگی یا ہمیشہ کی چپ، ایسے عالم میں دیوار پہ چاک سے لکھا ہوا ہونا بھی عزم و ہمت اور بے پایاں حوصلے کی علامت ہے۔[53]

صابر ظفر کی استعارہ سازی کے ارتقا کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں بتدریج نئے استعاروں کے جنم لینے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ تنہائی، صبر، خاموشی، نیام، تیغ، آئینہ، عکس، نقش کچھ خاص استعارے ہیں۔ ابتدائی کتابوں میں پائے جانے والے یہ استعارے وہ مستقل استعارے ہیں جو ان کے کلام میں بلوچستان کے تناظر میں لکھی جانے والی کتابوں سے پہلے کثرت سے موجود تھے لیکن پھر مزاحمت کے لیے محض آواز ہی بلند کرنے سے آگے بڑھنے کے بعد وہ تنہائی اور خاموشی یا صبر کی نہیں بلکہ آگے بڑھ کے اپنا حق وصول کر لینے کی بات کرتے ہیں۔

ے آخر تمام کاغذِ تنہائی جل گیا
کیا لکھ دیا کہ شہرِ شکیبائی جل گیا[54]

.

کربلا سے نسبت اور مغائرت بھی صابر ظفر کا مستقل موضوع ہے۔ وہ اپنی کربلا کے الگ ہونے کی بات بھی کرتے ہیں اور خود کو ہمیشہ کربلا میں موجود ہونے اور دار پر جھولنے والے فرد کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں اپنی جماعت کے لیے بھی یہ استعارہ موزوں تر ہو کے سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے مقتولین کو غاصبوں اور سیاسی طور پر اپنے آپ کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنے قتل کیے جانے کو بیان کرتے ہوئے کربلا کے استعارے کو استعمال کرتے ہیں:

؎ جو کٹ گئے ظفر وہی سر ہیں بلند آج
سر سبز ہیں وہی جو ہیں فصلیں جلی ہوئی[55]

.

خودی کی دیوار کو اتنا بلند کر لیا گیا ہے کہ اب اس کے دوسری طرف موجود لوگ اور بیانیہ عداوت کے شعلوں کی نظر ہو رہا ہے۔ ایسے میں یہ بلند بامی اور اس میں ظاہر ہونے والی دراڑ جو پہلے پہل سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں ظاہر ہوئی اس نے اتنی بڑی خلیج ایک قوم میں حائل کر دی جس کو پاٹنا ناممکن ہو گیا۔ ایسے میں اس نظریے پر ضرب ہر طرف سے پڑنی شروع ہوئی۔ دو قومی نظریے کی تعلیم نے مطالعہ پاکستان کے بیان کیے جانے والے تناظرات سے الگ ترقی پسند، مارکسی فکر یا غیر جانبدارنہ تجزیہ کرنے والے اذہان کو کچھ ایسے نتائج تک پہنچایا جسے ریاست کا بیانیہ جگہ دینے کو تیار نہیں۔ ایسے میں صابر ظفر جیسے واضح بات کرنے والے شاعر بھی جو شعر میں معانی کے نہ ہونے کو شدید عیب گردانتے ہیں ذاتی نوعیت کی علامات کو قومی علامتوں کو روپ دیتے ہیں۔

در، دیوار اور ان کا گرنا قومی واقعات اور سانحات کے ساتھ جوڑ کے اس قلعے کی فصیلوں میں نمودار ہونے والی دراڑوں کی نشان دہی شاعروں اور حساس فکر ادیبوں کا فرض ہے جسے صابر ظفر بھی پورا کر رہے ہیں۔ دونوں شعروں میں وہ اپنی سیاسی اور قومی نوعیت کے نظریات کو انقلاب اور جالب کے عوامی نظریے سے جوڑ کے اپنی ترقی پسند نسبت کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔

ایک سچے شاعر کے لیے صرف اپنے غنائی امیج کو برقرار رکھنے کے لیے موجود کی ثقالت اور جبر سے منہ پھیر کر گزر جانا بھی تو ممکن نہیں۔ اس کی حساسیت اگر اسے موجود کی جبریت کے خلاف احتجاج بلکہ جنگ پر آمادہ نہیں کرتی تو اس میں اور ایک اندھے الو میں فرق ہی کیا ہے؟[56]

؎ اور کیا چاہتے ہیں یار مرے
لکھ رہا ہوں میں ظلم کے رد میں[57]

.

"پاتال" میں سیاسی اور سماجی تبصرے کو صابر ظفر اپنے مذہبی نظریے سے جوڑتے ہوئے بار بار اظہار کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی اڑتالیسویں غزل میں بھی وہ ردیف "جہاں میں تھا" کے ذریعے پاکستان میں اقلیتوں کی مخدوش صورتِ حال کو غزلِ مسلسل کے انداز میں نظم کرتے ہیں۔ غزل آغاز سے اختتام تک اپنے پانچوں اشعار میں اس کی تفاصیل کو سمیٹ رہی ہیں۔

"صابر ظفر محنت کشوں اور مراعات سے محروم طبقے کا بہت بڑا شاعر ہے۔"[58]

؎ کہیں نہیں تھیں وہاں تتلیاں جہاں میں تھا
کہ وہ نہیں تھا کوئی گلستاں جہاں میں تھا[59]

.

مطلع میں موجود باغ اور اس کی مناسبت سے اس کے تلازمات اردو کی کلاسیکی شاعری میں موجود وطن کی طرف ہی اشارہ کر رہے ہیں۔ غزل کے یہ مضامین اسے شہر آشوب کے موضوعات سے جوڑتے ہیں۔ اپنی دھرتی پہ تتلیوں کے نہ ہونے کو وہ رنگ اور پرواز کے نہ ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لائے ہیں۔ آزادی پر ایسی پابندیاں جہاں فرد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہ مل رہا ہو انسانی حقوق کے حوالے سے مخدوش صورتِ حال کی عکاسی کر رہا ہے۔ دوسری طرف مصرعِ ثانی میں اپنی دھرتی یا کسی خاص جگہ کو گلستان نہ ماننے کا اعلان ایک ایسا اعلانِ بغاوت ہے جو عدم تعلق کے راستوں پر جا نکلتا ہے۔ جدید ریاستی نظام میں افراد کا اپنی ریاستی پالیسیوں پر یوں احتجاج ایک واضح سیاسی شعور کی نشان دہی کرتا ہے۔ شہروں اور ملکوں کے یہ آشوب فرد کے بعد کسی خاص گروہ کو اس عدم تعاون کے راستے پہ گامزن کرتے ہیں اور بعد ازاں اس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

؎ بغیر آگ کے جلتا چراغ چاہت کا
بجھے ہوئے تھے مگر جسم و جاں جہاں میں تھا[60]

.

نظریے کی آگ میں جلنا چاہت کے باعث ہو، عقیدے کے باعث ہو یا کسی خاص مقصد کے تحت ہو اس کے لیے خود کو وقف کرنے اور احتجاج کی روایت تو شاعری میں عام ملتی ہے لیکن یہ خاص روش جس میں خاموشی، صبر، تنہائی اور لاتعلق ہو جانے کے عناصر یکجا ہو رہے ہیں ہمیں صابر ظفر کے ہاں مستقل موضوع کے طور پر ملتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وہ جسم و جاں کے بجھے ہونے کو مزاحمت کے بجائے ایک ایسے جواز کے طور پر لا رہے ہیں جو تشدد یا مزاحمت دونوں ہی راستوں سے الگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

؎ فسادِ خلق کی تفصیل کیا سناؤں تجھے
کہ اٹھ رہا تھا دھواں ہی دھواں جہاں میں تھا[61]

.

پاکستانی اردو غزل میں تقسیم کے وقت فسادات کو بہت زیادہ بیان کیا گیا ہے لیکن صابر ظفر کے ہاں یہ جلی ہوئی بستیاں اور فسادِ خلق تقسیم یا بنگال کے سقوط کے علاوہ کچھ اور ہے۔ یہ وطن کی اندرونی کشمکش اور طبقات کے درمیان نفرتوں کی اس خلیج کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس نے

اسے اور اس کے قبیلے کے دیگر افراد کو آئینی حیثیت میں ہی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی حوالے سے بھی پاتال میں پہنچا دیا۔ یوں اس مجموعے میں موجود یہ کلام خاص سیاسی اور سماجی سیاق کا حامل ہو جاتا ہے۔

میں صابر ظفر کے مداحوں میں ہوں، وہ اس دور کا ممتاز اور بہت منفرد لب و لہجے کا شاعر ہے۔ اس کی غزل کا عصری شعور اور اس میں نظر آنے والے انسانی آشوب نے صابر ظفر کی غزل کو ایک شعری دستاویز بنا دیا ہے۔ بلوچستان کے شہدا پر لکھا جانے والا مجموعہ اس کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ [62]

دھواں آگ لگنے کے بعد مسبب کے طور پر سامنے آنا والی وہ چیز ہے جو آگ سے بھی زیادہ الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہونے سے تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں اور کچھ بھی واضح انداز میں سامنے نہیں آ پاتا۔ یہ دھواں اگر تعلقات میں حائل ہو تو اسے دور کرنے کے لیے آگ کے سلگتے چلے جانے کو روکنا اور کچھ نئی ہواؤں کا چلنا لازمی ہو جاتا ہے لیکن جہاں شاعر ہے وہاں ایسا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ شاعر یہاں ایک فرد سے بلند ہو کے ایک طبقہ یا گروہ بن جاتا ہے جس کے لیے دھرتی کے کنارے تنگ کیے جاتے ہوں اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہر جگہ اسے مقید کرنے اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹنے پہ مجبور کیا جاتا رہا ہو۔ شعر میں ایسی ہی صورتِ حال کو بیان کیا جا رہا ہے۔ غم گساروں کا نہ ہونا تنہائی کا وہ کرب ہے جسے جھیلنا شاعر کا مقدر رہا ہے۔

ے　خموش میں ہی نہ تھا اس مناظرے میں ظفرؔ
مری طرح تھے سبھی بے زباں جہاں میں تھا [63]

.

آزادیِ اظہار کی یہ صورتِ حال جس میں افراد یا طبقات کو کسی سماج میں اپنا نقطہ نظر بیان کر دیے جانے سے روک دیا گیا ہو وہاں نمودار ہوتی ہے۔ اپنے سیاسی نظریے میں بھی ترقی پسند ہونے اور دوسری طرف مذہبی نظریے کی وابستگی سے بھی شاعر ایسی ہی صورتِ حال کا شکار رہے ہیں۔ شاعری میں یہ اظہار انھیں اپنی خموشی کو ایک آواز دینے کا وسیلہ نظر آیا جس کو انھوں نے مسلسل لکھ لکھ کر جاری رکھا۔

صابر ظفر جس محروم طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے خود کو ایک فرد کی طرح پیش کرتے ہوئے اپنے قبیلے کے دیگر افراد کی طرف سے کمک آنے کے منتظر ہیں اسے بھی غالب کی طرح اپنے بارے میں سماجی رویوں کے بارے میں علم ہو چکا ہے کہ وہ بہت سے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے ایسے میں اس گروہ کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ شدید تنہائی کا شکار بھی ہے اور سماجی ہی نہیں خاندانی اور خونی رشتوں کی طرف سے بھی مغائرت اور بے گانگی کے رویوں کا سامنا کر رہا ہے۔

ے　اٹھا رہے ہیں فصیلیں جو دوسروں کے لیے
عجب نہیں کہ انھیں بھی ملے نہ راہِ نجات [64]

.

شاعر کی یہ پیش بینی معاشرے میں عدم برداشت کے کلچر پر وہ گہرا طنز ہے جس کا خمیازہ پاکستان نے آنے والے سالوں میں خوب بھگتا۔ وہ لوگ جو دوسروں کے لیے سیاسی، سماجی، مذہبی اور لسانی حوالوں سے گڑھے کھود رہے تھے انھوں نے وطن کے دولخت ہونے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا اور اپنی اسی روش پہ گامزن رہے جس نے آنے والے سالوں میں ہزاروں لوگوں کو دہشت گردی اور مذہبی انتہاپسندی کی نذر کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی

اور علاقائی تحریکوں کے نتیجے میں بھی ان فصیلیں اٹھانے والوں نے دیکھا کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ محاصرے میں آتے چلے گئے۔ جن لوگوں نے روشنیوں کے شہر کو اندھیروں کے سپرد کیا پھر ان کے لیے بھی سیاسی طور پر اندھیرے ہی مقدر ہو گئے۔ مکافاتِ عمل کے فطری اصول کو صابر ظفر نے ظالم طبقوں کے لیے نصیحت کے ایسے انداز کے ساتھ پیش کیا ہے جو تلخی اور طنز کی آمیزش میں گندھا ہوا ہے۔

حاصل بحث: اگر ہم اس مقالے پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صابر ظفر ایک ایسا شاعر ہے جو معاشرے کے محکوم طبقے کی آواز کا ترجمان ہے۔ مذکورہ بالا تحقیقی مقالے میں بھی صابر ظفر نے اپنی غزل میں حاکم اور محکوم کے ساتھ ہی مغضوب و معتوب طبقے کے دکھ بھی بیان کیے ہیں۔ بالادست اور زیر دست طبقے کے ساتھ ہی ہمارے ہاں ایسے افراد، گروہ اور جماعتیں بھی ہوتی ہیں جن کو اچھوت سمجھ کے پاتال کا باسی بنا دیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام گروہوں کی بات کرنے کو اپنا نصب العین جانتے ہیں۔ جن کے موقف کی پذیرائی اور سماعت پر نہ ہی بالادست طبقہ راضی ہوتا ہے اور نہ ہی پسے ہوئے طبقے کو بھی ان کے دکھوں سے کوئی غرض ہوتی ہے۔ صابر ظفر کا شعری سلسلہ ابھی جاری ہے اور اس میں پائے جانے والے امکانات ہر نئی آنے والی کتاب کے ساتھ کچھ اور نئی جہات کو شامل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی زود گوئی اردو غزل کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جس کی بدولت اردو غزل کا دامن ابھی تک بنتالیس (45) اہم شعری مجموعوں سے آراستہ ہو چکا ہے۔

سفارشات:

1-اس مقالے کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ معاشرتی محکومی، احساس کمتری، سماجی عدم انصاف نے جو سماجی تفریق قائم کر رکھی ہے اس کے خاتمے کیلئے معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کو نہ صرف غربت کی زندگی سے باہر نکالنا ہو گا بلکہ ان کے معاشرتی عدم مطابقت کی بجائے سماجی انصاف کی بنیاد رکھنی ہو گی۔

2-اس مقالے کی روشنی میں ایک اور تجویز یہ بھی ہے کہ معاشرے کے تمام طبقوں کو احساس محرومی اور احساس کمتری سے نکالنے کی روش اپناتے ہوئے وسائل کی منصفانہ تقسیم اور فراہمی کو یقینی بنا ہو گا تا کہ ایک خوشحال معاشرے کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔

References:

[1] Sabir Zafar, Shahadat Nama, P:70 0
[2] Riaz Majeed, Doctor, Sabir Zafar Ki Ghazal, Sittarah War Sukhan, P:11
[3] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishq, Barah Dari Mein Shaam, P:434
[4] Sabir Zafar, Ghazal Andar Ghazal, P:42
[5] Saleem Kousar, Sabir Zafar Ke Lia Aik Tehreer, Sandal Ki Tarah Sulagte Rehna, P:19
[6] Sabir Zafar, Ghazal Andar Ghazal, P:63
[7] Sabir Zafar, Awargi Ke Par Khule, P:55
[8] Sabir Zafar, Parindon Ki Tarah Shamen, P:11
[9] Khurshid Rizvi, Sittarah War Sukhan, Pas-e-Sar-e-Wark
[10] Ghulam Hussain Sajid, Pash-e-Lafz, Shahadat Nama, P:5
[11] Sabir Zafar, Ibtida, P:38
[12] Ahmad Nadeem Qasimi, Sabir Zafar Ki Ibtida, Al-Tehreer, Lahore, 1974, P:12
[13] Sabir Zafar, Ibtida, P:57
[14] Sabir Zafar, Ibtida, P:65
[15] Sabir Zafar, Ibtida, P:60
[16] Sabir Zafar, Ibtida, P:68
[17] Sabir Zafar, Ibtida, P:72
[18] Sabir Zafar, Ibtida, P:73

[19] Fahmida Riaz, Farz Ka Karz, Mashmulah, Gardish-e-Marsia, P:18
[20] Sabir Zafar, Ibtida, P:83
[21] Sabir Zafar, Ibtida, P:88
[22] Sabir Zafar, Ibtida, P:89
[23] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Barah Dari Main Shaam, P:399
[24] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Barah Dari Main Shaam, P:402
[25] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Barah Dari Main Shaam, P:413
[26] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Barah Dari Main Shaam, P:416
[27] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Barah Dari Main Shaam, P:426
[28] Sabir Zafar, Ibtida, P:40
[29] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Dhuwan Aur Phool, 96
[30] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Dhuwan Aur Phool, P:99
[31] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Dhuwan Aur Phool, P:99
[32] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Dhuwan Aur Phool, P:101
[33] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Dhuwan Aur Phool, P:102
[34] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Ik Teri Yaad Reh Gayi Baqi, P:492
[35] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Ik Teri Yaad Reh Gayi Baqi, P:497
[36] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Be Ahat Chali Ati Hai Mout, P:640
[37] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Be Ahat Chali Ati Hai Mout, P:38
[38] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Chain Ik Pal Nahin, P:70
[39] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Chain Ik Pal Nahin, P:725
[40] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Chain Ik Pal Nahin, P:725
[41] Sabir Zafar, Apne Rangon Mein Doob Jane Dai, P:31
[42] Sabir Zafar, Apne Rangon Mein Doob Jane Dai, P:36
[43] Sabir Zafar, Apne Rangon Mein Doob Jane Dai, P:41
[44] Sabir Zafar, Apne Rangon Mein Doob Jane Dai, P:127
[45] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishq, Ishq Mein Rog Hazar, P:598
[46] Sahar Insari, Professor, Aik Aur Zindan Nama, P:11
[47] Ahmad Nadeem Qasmi, Zindan Mein Zindagi Amar Hai, Back Flap
[48] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:222
[49] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:258
[50] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:228
[51] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:228
[52] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:239
[53] Faheem Shanas Kazmi, Doctor, Pesh-e-Lafz, Deewar Pe Chaak Se Likha Hon, P:11
[54] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:243
[55] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:190
[56] Ghulam Hussain Sajid, Pash-e-Lafz, Shahadat Nama, P:4
[57] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:249
[58] Anwar Ahmad, Doctor, Baik Flep, Shahadat Nama
[59] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:249
[60] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:249
[61] Sabir Zafar, Mazhab-e-Ishaq, Pattal, P:249
[62] Tabassum Kashmiri, Doctor, Baik Flep, Shahadat Nama
[63] Sabir Zafar, Ibtida, P:40
[64] Sabir Zafar, Ibtida, P:41

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.